دینی فکر و شعور اور اُس کا دائرۂ کار

محمد علال الفاسی ◉ ترجمہ: محمود احمد غازی

محمد علال الفاسی مراکش کے مشہور سیاسی رہنما، عالم، مصنف، شاعر اور ماہر تعلیمات ہیں، آج کل مراکش کی مقبول ترین سیاسی جماعت "حزب الاستقلال" کے صدر اور رباط یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے پروفیسر ہیں، "حزب الاستقلال" وہی پارٹی ہے جس نے شاہ محمد پنجم مرحوم کی قیادت میں مراکش کو فرانسیسی استعمار کے پنجے سے رہائی دلائی تھی، علال الفاسی کو بچپن ہی سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق تھا، چنانچہ چوبیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ دو مرتبہ جیل میں بھیجے جا چکے تھے۔ اگرچہ فاسی یونیورسٹی میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے ممتاز تھے اور امتحان بھی اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا تھا پھر بھی محض اس بناء پر اُن کو ڈگری دینے سے انکار کر دیا گیا کہ انھوں نے سیاست میں حصہ نہ لینے کی ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

علال الفاسی کا شمار عرب دنیا کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے، ایک شاعر کی حیثیت سے اُن کی شہرت زیادہ تر اُن کی قومیت و وطنیت کے جذبہ سے بھرپور نظموں کی مرہونِ منت ہے۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۳ء تک کئی مرتبہ ملک بدر کیے گئے، گرفتار کیے گئے اور نہ جانے فرنگی استعمار کے کتنے مظالم سہے، ایک بار تو اُن کی جماعت ہی خلافِ قانون قرار دے دی گئی، لیکن آخر کار فاسی اپنی جدوجہد میں کامیاب ہوئے اور ملک آزاد ہو کر رہا۔

فاسی نے دنیا کے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا ہے، وہ پاکستان، بھارت، امریکہ، اسپین، قاہرہ، سعودی عرب اور بہت سے ملکوں کے متعدد دورے کر چکے ہیں۔ حال ہی میں اُنھوں نے رباط میں ہونے والی اسلامی سربراہ کانفرنس میں بھی مبصر کی حیثیت سے شرکت کی ہے۔

یوں تو علال الفاسی کی بہت سی تصنیفات ہیں، لیکن اُن کی تین کتابیں بہت اہم اور فکر انگیز ہیں، اور دراصل یہی تین کتابیں ہیں جن پر اُن کی شہرت کا دار و مدار ہے۔

۱۔ النقد الذاتی۔ اس میں اُنھوں نے مختلف فکری، معاشی اور معاشرتی مسائل کا بہت

عمدگی سے تجزیہ کیا ہے اور بڑی قابلِ قدر بحثیں کی ہیں۔ اور اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والے بہت سے مسائل کا حل پیش کیا ہے، ——— ۲- مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ ومکارمھا۔ اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، اس میں انہوں نے شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد اور دوسری شریعتوں سے موازنہ کر کے اسلامی شریعت کی خوبیاں واضح کی ہیں ——— ۳- تاریخ الحرکات الاستقلالیۃ فی المغرب العربی۔ افریقہ کے شمال مغربی ملکوں — مراکش، تونس، الجزائر، لیبیا — میں استعمار کے خلاف آزادی کی جدوجہد کرنے والی تحریکات کی تاریخ ہے۔ ان کتابوں میں النقد الذاتی انتہائی فکر انگیز و بلند پایہ کتاب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے چند اہم ابواب کا ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کریں۔ ذیل میں ہم اس کتاب کے دوسرے حصے کے دوسرے باب "الفکر الدینی" کا ترجمہ پیش خدمت کر رہے ہیں۔ آئندہ بھی انشاء اللہ اس بے نظیر کتاب کے بعض ابواب کا ترجمہ ماہ بماہ پیش کریں گے۔

(مترجم)

مسئلہ دین یا تو دنیا بھر میں ایک اہم مسئلہ رہا ہے یا پھر اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی، یعنی یا تو دینی مسئلہ تمام اُمور پر غالب رہا یا پھر سرے سے اسے کوئی مقام ہی نہیں دیا گیا۔ دین کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو سے خاص کر دینا بڑا غلط خیال ہوگا۔ ہمہ گیری اور ہر شے میں جاری وساری ہونے میں صرف دین ہی وہ واحد شے ہے جسے فطرت سے مشابہت دی جاسکتی ہے، لہٰذا ایک قوم کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں یا تو مکمل طور پر دینی تعلیمات سے بے اعتنائی اور الحاد کا طریقہ اختیار کرے یا پھر کلی طور پر دینداری کو اپنالے، تاریخ میں دونوں قسم کے گروہوں کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ لیکن جب ہم تاریخِ عالم میں مختلف قوموں کی اجتماعی زندگی کے طور طریقوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جب بھی کسی قوم میں الحاد، دہریت اور دینی تعلیمات سے بے اعتنائی نے راہ پکڑی وہ قوم پس ماندگی کا شکار ہوئی اور اُسے عزت وسروری کے بلند مقام سے ہٹ کر ذلت وپستی میں واپس آنا پڑا، اور جس قوم نے اپنے معاملات حل کرنے میں بلند دینی اقدار کو ملحوظ رکھا اس نے اپنی زندگی کے ساتھ اپنے مرتبہ اور اپنی عظمت کو بھی باقی رکھا، قدیم یونانیوں کی زندگی سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں، یہ اُن کی روحانی بلندی ہی تھی جس نے اُن کو ایک ایسی لازوال قوم بنا دیا تھا کہ تاریخ میں اُس کے تہذیب وتمدن

کی مثال نہیں ملتی۔ یہی صورت ہمیں رومی اور قرطاجی تاریخ میں ملتی ہے۔

یہ حقیقت اور بھی واضح اور پوری طرح نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم تاریخِ اسلامی کے اس دَور پر نظر ڈالتے ہیں جس میں وہ اپنے اوجِ کمال پر تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دنوں اسلام ہی وہ رواں دواں فکری قوت تھی جو ملک و ملت کی رگ و پے میں گرم خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔ لیکن جب عجمی سازشیوں کے ذریعے تباہ کن خیالات لوگوں کے قلوب میں راہ پانے لگے اور دین سے بے اعتنائی عام ہوئی تو اسلامی تہذیب کا عبرتناک تنزل بھی ہمارے سامنے ہے، یہ تاریخی حقیقت عظیم مصلح علامہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ پر منکشف ہو گئی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنی گرانقدر تالیف "ردّ نیچریت" کے ذریعہ تاریخی تجربوں کی روشنی میں مختلف تہذیبوں اور تمدنوں پر دین و ایمان کی اثر اندازی کی عقدہ کشائی کی۔

ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو دین، اس کے مطلوبہ عقائد، اور اس کے پیش کردہ نظامِ حیات سے خود کو پورے طور پر آزاد کر سکے، حتیٰ کہ آج روس وغیرہ میں جو لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے مسیحیت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے کہ انھوں نے ایک ایسا مادیت پر مبنی دین گھڑ لیا ہے جو ابھی تک یہ جرأت نہ کر سکا کہ اپنے سیاسی نظریات کے سوا مسیحی روحانیت اور اس کی بلند اخلاقی اقدار کو خیرباد کہہ دیتا، موجودہ زمانے کے مادہ پرست لوگ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکے ہیں وہ صرف اسی حد تک ہے کہ وہ عوام کو مذہبی قدروں اور اخلاقِ عالیہ سے بے اعتنائی برتنے کی تلقین کرتے ہیں، اگرچہ وہ خود ان چیزوں سے مکمل چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔

جب ہم ان بڑے بڑے انقلابات پر غور کرتے ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں رُونما ہوئے اور جنھوں نے کلیسائی نظام کو ڈھا دیا، مذہبی گروہ کی پکڑ دھکڑ کی اور مختلف طبقوں کے املاک کا خاتمہ کیا، لادینیت (سیکولرزم) کے علمبردار ہو کر نکلے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان انقلابات کی تہہ میں بنیادی مقصود و محرک صرف اس پاپائی نظام کا استیصال تھا جسے مسیحیت نے اپنے تاریخی تجربات کے دَور میں جنم دیا تھا، قرونِ وسطیٰ میں ظہور پذیر رہبانیت کے خلاف یہ انقلاب، دینِ خالص کے اتنا مخالف نہیں جتنا اُس کے موافق ہے۔ بالخصوص اسلام کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایسے انقلاب کو خوش آمدید نہ کہے جو دین و مذہب کے نام سے لوگوں کی عقول و اجسام پر حکمرانی کے استبداد کو ختم کرتا ہو یا انسانوں کے کسی ایسے گروہ کے خلاف آواز بلند کرتا ہو جس نے مذہبی قانون سازی کے اختیارات ہتھیا لئے ہوں یا روحانی تقدس کے مقام پر ناجائز قبضہ کر لیا ہو اور اس طرح خود کو خدا یا نیم خدا کا درجہ دے لیا ہو۔ اس لئے کہ اسلام نے سب سے پہلے جس چیز سے

منع کیا ہے وہ انس وجن میں سے کسی بھی سرکش قوت کے سامنے نفوس وارواح کو جھکانا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم ہر ایسے پیشوائی نظام کے خلاف انقلاب برپا کرنے والوں میں پیش پیش ہوں جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان خود کو حائل کرے، ہماری دینی فکر کی تعمیر تو صرف اس بنیاد پر ہونی چاہیئے جو لوگوں کو خدا اور دین کے سامنے برابر قرار دے۔

اسلام نے عقل کا مرتبہ بلند کیا اور قرآن کریم نے بیسیوں آیتوں میں غور وفکر کرنے اور عقلِ سلیم اور فکرِ رسا سے فیصلہ لینے کی ترغیب دی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسے اپنا معجزہ اور اپنی دعوت کا مقصود تک قرار دیا ہے، اس سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ہم عقل کی جملہ صلاحیتوں پر بغیر کسی جھجک کے بھروسہ رکھیں اور اپنے دینی تفکر وتدبر میں عقل کو پوری پوری اہمیت دیں تاکہ وہ عقل کے ساتھ پورے اتفاق وہم آہنگی سے آگے بڑھتا ہے۔

اور اب جبکہ یورپی ادب وتہذیب سے ہمارا ربط ضبط ہمارے سامنے اس عظیم معرکہ کو لے آئے گا جو اٹھارویں صدی سے مذہب اور سائنس کے درمیان برپا ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ حقائق سے آنکھیں بند نہ کرلیں اور کسی ایسے معاملہ میں نہ الجھیں جس کا ہمارے مسئلہ سے تعلق نہ ہو۔ اس لئے کہ اسلام کے نزدیک دین علوم اور سائنس کا مددگار ہی ہوسکتا ہے، اور یہ کیسے ممکن ہے کہ علم وسائنس کو دین ومذہب کا مخالف اور منافی سمجھ لیا جائے جب کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے:

فضل العالم علی العابد — عالم کو عابد پر ایسی ہی برتری حاصل ہے جیسی فضیلت مجھے تمہارے
کفضلی علی ادناکم — ایک ادنیٰ شخص کے مقابلہ میں حاصل ہے۔

یہ معرکہ جو یورپ میں مذہب اور سائنس کے درمیان برپا ہوا درحقیقت سائنس کی طرف سے کلیسا کی محکمانہ افکار کی کلی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی جد وجہد تھی۔ جس میں بالآخر سائنس اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہوگئی۔ اور اس نے اپنے لئے ایک ایسا خاص میدان بنالیا جس میں نہ مذہب اس کا حریف بن سکے گا نہ عقل، اس لئے کہ ان دونوں — مذہب وعقل — کا میدانِ عمل انسان کا اندرون ہے جب کہ سائنس کا دائرۂ کار مظاہرِ حیات میں تجرباتی دنیا سے ہے۔ چنانچہ ہماری دینی فکر کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ مملکتِ سائنس کی خودمختاری کی تائید کرے۔ بشرطیکہ وہ (سائنس) ان میدانوں میں دخل اندازی کی کوشش نہ کرے جو تجربہ کی رسائی سے بالاتر اور کیمیاوی تحلیل کے لئے ناقابلِ قبول ہوں۔ بہت سے نظریات ایسے بھی ہیں جو یورپ میں ان کے مذہبی تصور کے

اعتبار سے بڑے معرکۃ الآراء اور محلِ بحث رہے ہیں، لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے لئے یہ مسائل سرے سے موجود ہی نہیں لہٰذا ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم ان نظریات پر غور و فکر کرنے میں اپنا وقت ضائع کریں یا ان مسائل پر بحث و تکرار کرنے والوں میں سے کسی ایک فریق کی موافقت یا مخالفت کریں۔ مثال کے طور پر "پیدائشی جرم" کا مسئلہ ہے جس کا ارتکاب آدم نے کیا اور انسان نے اس گناہ کو وراثت میں پایا۔ یہ "جرم" جسے عیسائیت نے تسلیم کیا ہے، اور اس کی وجہ سے فکری زندگی میں یورپی علمی انقلاب کے دور سے لے کر اب تک وہاں بہت سی ہولناک جنگیں بھی ہو چکی ہیں، جن کا ایجابی و سلبی طور پر یورپ کی ذہنیت و عقلیت میں بڑا اثر ہے۔ اس لئے کہ یہ نظریہ بہت سے ملحدانہ مدارسِ فکر کی پیدائش کا سبب ہوا، اگر آپ یورپی ادب کا مطالعہ کریں تو اس کے پورے ادب ہی میں نہیں بلکہ فلسفہ میں بھی حتیٰ کہ بیشتر سیاسی نظریات میں بھی اس موضوع پر کافی بحث و مناقشہ پائیں گے۔

لیکن جب ہم اس نظریہ کو اسلام کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہم اسلامی مقتدرات میں اسے کلیۃً مفقود پاتے ہیں، قرآن تو صاف صاف کہتا ہے:

عصیٰ اٰدم ربہ فغوی — آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اس لئے وہ راستہ سے ہٹ گئے۔

ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت ہے کہ خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی:

ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ — پھر اس کے رب نے اُسے پسند کر لیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اُسے صحیح راستہ پر لے آیا۔

بنا بریں اسلام وراثتی جرم کا قائل نہیں اور اس کی نظر میں ہر شخص اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے کل امرئ بما کسب رھین۔ الغرض ہماری دینی فکر کو کسی بیرونی عقیدہ سے متاثر نہ ہونے میں پوری احتیاط لازم ہے تاکہ وہ بیجا مشکلات پیدا نہ کرے، اور اس قسم کے بہت سے نئے نئے عقائد اور غیر اسلامی نظریات کے مقابلہ کا طریقہ معلوم کر لے۔ اس قبیل کے عقائد و نظریات اس سے کہیں دور ہیں کہ انھیں مسلم ذہنیت یا مراکشی عقلیت کے عناصر میں سے ایک عنصر مانا جائے۔

اس بات سے بھی آگاہ رہنا ضروری ہے کہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے دور کسی میدان میں محصور کر دینے کا تصور دراصل اہلِ یورپ کے دین اور سائنس کے درمیان تطبیق کی کوششوں میں مسلسل ناکامیوں سے پیدا ہوا ہے، اور جب کہ سائنس اپنے میدانِ عمل میں خود مختار ہے یہ کوشش بے معنی ہوگی کہ دین کو اپنے اس دائرہ کار سے دور کیا جائے جو اس کے لئے مخصوص ہے، دین کا یہ میدان روزمرہ کے کام اور افراد و جماعات

کے درمیان اجتماعی تعلقات ہیں، یہ تعلقات ہمیشہ مسلّمہ علمی اور ناقابلِ تنقید بنیادوں پر قائم نہیں ہوتے بلکہ عموماً لوگوں کے جذبات و مفادات کے تبادلہ اور بیشتر ان ضروریات پر مبنی ہوتے ہیں جنہیں اہلِ یورپ تجارت و سوداگری یعنی طرزِ معاشرت اور باہمی رابطہ و تعامل سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بات صرف ایسی تنظیم سے ہی ممکن ہے جو حکمتِ عملی اور دوستانہ جذبات کے ذریعے قائم ہو، اور یہ دونوں باتیں صرف اور صرف اُس ہمہ گیر عقیدہ میں پائی جا سکتی ہیں جس میں جسمانی میل ملاپ اور بھائی چارہ سے قبل روحانی میل ملاپ اور بھائی چارہ ہوتا ہو۔ لہٰذا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ دین کا تعلق صرف چند نمازوں اور نجی کردار کی بعض صورتوں سے ہے۔

بقول جارج برنانو، پیغمبروں کو صرف اس لئے مبعوث نہیں کیا گیا کہ وہ حسینوں سے معاشقہ اور مے نوشی سے منع کریں ——— بلکہ اس کے علاوہ ان کو ایک اور عظیم ترین مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے۔ یعنی اُس صحیح ھدایت کو وہ لوگوں تک پہنچا دیں جو اُن (لوگوں) کے لئے دنیا اور آخرت کی نیکیوں اور اچھائیوں کا راستہ کھول دے، حقیقت یہ ہے کہ دینی عبرت و نصیحت آموزی سے محروم ہو جانا ان تمام فضائل سے محروم ہو جانے کے مترادف ہے جن کو انسان نے وحی الٰہی کی برکت سے حاصل کیا ہے اور جن کے زیرِ سایہ ہزاروں نسلوں نے اللہ پر اعتقاد کے طفیل تربیت حاصل کی ہے۔

جب ہم اس نظریہ کا ذرا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں جس کے بموجب دین اور سیاست جدا جدا چیزیں قرار پاتی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظریہ کے تحت حکومت در حکومت قائم کرنے کی ایک کوشش کی جاتی ہے، 'طارد یو' اپنی کتاب "گرفتار بادشاہ" میں کہتا ہے کہ "تاریخی طور پر اس نظریہ کا ظہور دراصل بعض جرمن راہبوں کی طرف سے حکومت کے خلاف ایک قسم کا ردعمل تھا، اس لئے کہ حکومتِ جرمنی عیسائیت کو ختم کرنے کے درپے تھی"۔ ہم 'طارد یو' کی اس تحقیق پر مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر اس نظریہ کا منبع وہ اساسی کلیہ ہے جو انجیل نے پیش کیا ہے "جو خدا کا ہے وہ خدا ہی کا ہے اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر ہی کا ہے"۔ اس لئے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نظریہ دراصل مسیحیت کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے وہ غلط رائے رکھتے ہیں، اس لئے کہ یہ تو مسیحیت ہی کا ایک اصول ہے، پھر انقلاب و بغاوت چہ معنی دارد؟۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت مسیحؑ نے اوّل اوّل اس نظریہ کو ان رومی شاہنشاہوں کی دخل اندازی سے بچنے کے لئے اپنایا ہوگا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول نہیں کیا تھا، اس نظریہ کو قبول کر لینے سے حضرت مسیحؑ کا مقصد بتدریج اختیاراتِ سلطنت پر قبضہ کر لینا تھا تاکہ بعد میں اُن کے جانشینوں اور نمائندوں کو یہ حق حاصل رہے کہ جسے چاہیں تخت نشین بنا دیں۔ چونکہ پاپائے تسلط کا اسلام میں کوئی تصور موجود نہیں اس لئے اسلام اپنی پوری تاریخ میں کبھی اس بات پر مجبور نہیں ہوا کہ اس طرح کا

کوئی نظریہ گھڑے، اسلامی نظام حکومت میں اختیارات عوام کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔ جسے عام مسلمان اچھا سمجھیں وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہے۔ اگر کہیں اسلام کو بھی انہی مصائب کا شکار ہونا پڑتا جن مصائب کا شکار مسیحیت کو ہونا پڑا تو شاید فرزندانِ اسلام کو بھی کچھ ایسا ہی عجیب و غریب نظریہ اختیار کرنا پڑتا۔

لیکن ان لوگوں نے اسلام کو نہیں سمجھا، اسلام تو حقیقت میں دوسرے تمام نظاموں اور ان کے چلانے والوں پر برتری اور غلبہ رکھتا ہے حتیٰ کہ بعض سرکش مسلم حکام بھی اگر کوئی کام کرتے ہیں تو اُسے اسماً اور صورۃً اسلام ہی بتاتے ہیں، چنانچہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کی لامذہبی فکر ہمارے برادر ملک الجزائر میں پھیل رہی ہے، اس لئے کہ مسلمان علماء سمجھتے ہیں کہ دینی امور کو اسی طرح ان غیر ملکی حکام کی دست برد سے بچایا جا سکتا ہے جو الجزائر پر مسلط ہو گئے ہیں۔ جب کہ ہمیں ابھی تک اس نظریہ کا کوئی گہرا اثر کسی بھی ایسے اسلامی ملک میں نظر نہیں آتا جس نے ہر قسم کی ترقی کے باوجود اپنے مذہبی اُمور کی بالادستی کو باقی رکھا ہو۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ترکی جو حکومت کی لامذہبیت کا دعوے دار ہے وہ اپنے تمام مذہبی معاملات کو اپنی قومی پارلیمنٹ ہی میں طے کرتا ہے، ترکی حکومت کے عوام و خواص اس پارلیمنٹ میں مذہبی اُمور سے متعلق جملہ تنقیدیں اور اعتراضات سننے کے پابند ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالات ـــ اور اعتقادات کا صحیح دینی راستہ اختیار کرنے میں بڑا اثر ہوتا ہے اس لئے کہ دینی نظریہ کو اسی راستہ کے مطابق باقی رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بڑی بے وقوفی ہو گی کہ ہم یورپ کے کسی سیاسی یا معاشرتی نظریہ کو پورے طور پر اپنا لیں نہ تو اس کا گہری نظر سے جائزہ لیں اور نہ ان بنیادی عوامل کا مطالعہ کریں جنہوں نے اس نظریہ کی تشکیل کی ہے اور نہ اسے اپنے قومی تجربات کی روشنی میں پرکھیں اور نہ اپنی اس ذہنیت سے فائدہ اُٹھائیں جس کی تعمیر میں بڑا حصہ اسلام کا ہے اور نہ یہ دیکھیں کہ ہمارا ذہن اس نظریہ کو پسند کرتا ہے یا ناپسند۔

اسلام میں دینی فکر و نظر کا مطلب کامل آزادی ہے ـــ اسلام کا مطلب ہے ہر حال میں اعلیٰ اقدار کو پیشِ نظر رکھنا اور ان کی اہمیت کو سمجھنا اور کسی بھی ایسے فرد یا جماعت کا حکم ماننے سے انکار کر دینا جو خود کو اس دنیا میں اللہ کے نمائندہ کا مقام دینے کی کوشش کرے یا دین کے نام پر لوگوں کو اپنی ذلیل خواہشات کا غلام بنائے ـــ اس اعتبار سے دینی فکر و نظر ایک ایسی حس ہے جس کے ذریعے ہم اچھائی، برائی اور خیر و شر میں امتیاز کر سکتے ہیں اور خوشگوار و حسین میں امتزاج پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طرح مذہبی فکر ایک انتہائی اہم پیمانہ ہے جس کا ہر وقت ہمارے ساتھ رہنا ضروری ہے تاکہ اس کی مدد سے ہم کسی فکر یا کسی نظریہ کو اختیار کر سکیں اور اس پر بھروسہ کر سکیں۔